بشیر احمد ڈار

# سچی باتیں

(۱۲ ستمبر ۵۸ء) کے صدق جدید کی سچی باتوں میں مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں :-

## فقہائے اُمت کے لیے

اسٹیٹسمین (یکم ستمبر) کی ایک خبر کا خلاصہ :-

"وانکوور سے ٹوکیو کا سفر برسٹل ایر کرافٹ لمیٹڈ کمپنی کے بنائے ہوئے برٹینیا طیارے سے کنیڈین پاسیفک ایرلائینز نے ۲۸ اگست کو وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیز تر رفتار سے طے کر لیا اور برطانیہ کی کمپنی مذکور نے دعویٰ کیا ہے کہ جاپان اور کنیڈا کے درمیان کا یہ سفر (گھڑیوں کے معیار سے) شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو گیا! یعنی جس تاریخ کو ٹوکیو سے سفر شروع ہوا تھا جب طیارہ وانکوور پہنچا ہے تو وہاں بھی وہی تاریخ تھی اور یہ تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال پیش آ کر رہی ۔"

یعنی کوئی ۴ ۱/۲ ہزار میل کا ہوائی سفر مغرب سے مشرق کی سمت اتنی مدت میں ختم ہو گیا جتنی میں خود زمین اپنی گردش محوری پوری کر سکی ۔ گویا گھڑی اور جنتری کے عام معیار سے، اس میں کچھ وقت بھی نہ لگا اور اگر اتوار کو صبح شروع ہوا تھا تو ختم بھی اتوار ہی کی صبح کو عین اسی وقت ہو گیا۔ آناً فاناً ــــــ اس بالکل جدید صورت حال کا اثر نماز کے پنجگانہ اوقات پر، روزہ کی مدت پر، نماز کے رُخ پر، موقت معاہدوں کی تکمیل پر اور دوسرے مسائل پر کیا پڑے گا ۔ ایسی ہی چیزوں کے طے کرنے اور قدیم فیصلوں پر ازسرِ نو غور کرنے ہی کے لیے تو ضرورت اور شدید ضرورت صاحب علم و صاحب فہم فقہائے اُمت کے ایک جدید اجتماع کی ہے ــــــ مجلس ندوہ میں اگر قدیم زندگی باقی ہوتی تو وہی دعوت نامے سارے عالم اسلامی کے ممتاز فقیہوں ؛ فاضلوں کے نام جاری کر کے انہیں مشورت کے لیے یکجا کر سکتی تھی ۔

خط کشیدہ الفاظ کو ایک بار پھر غور سے پڑھ جائیے تو چند باتیں بہت نمایاں طور پر نظر آئیں گی مثلاً :

۱- مولانا اس بات کے قائل ہیں کہ فقہی مسائل متبدل ہوتے ہیں ۔ اور مسائل بھی وہ جو معمولی نہیں بلکہ چوٹی

کے ہیں۔ نماز روزے تک کے مسائل کسی دور میں تغیر احوال سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

۲۔ مولانا فقہا کے ایک جدید اجتماع کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ گویا تشکیل فقہ جدید کی آرزو اندر سے چٹکیاں لے رہی ہے۔

۳۔ اس تشکیل کے اہل مولانا کے نزدیک عام کند ذہن، جامد فقہا نہیں بلکہ صرف صاحب علم و صاحب فہم فقہا ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔

۴۔ صاحب علم و صاحب فہم فقہا کے اس اجتماع کو صرف ندوۃ العلماء کی مجلس منعقد کرنے کی اہل ہو سکتی تھی۔

۵۔ مگر موجودہ ندوہ نہیں بلکہ قدیم زندگی والا ندوہ۔ گویا پہلے تو ندوے میں زندگی تھی۔ صاحب علم و صاحب فہم فقہا تھے اور اب نہ زندگی ہے نہ صاحب علم و صاحب فہم فقہا ہی رہے۔ بلکہ جو کچھ ہے وہ جمود ہے، کم علمی ہے اور کم فہمی ہے۔

گزارش ہے کہ:

۱۔ مولانا کے نزدیک نماز روزے تک کے مسائل تو اپنی قدیم شکل میں تغیر کا مطالبہ کرنے لگے ہیں لیکن تعدد ازدواج؟ ..... اور اسی طرح کے بعض اور مسائل؟ - اسے نہ پوچھیے۔ یہ مولانا کے نزدیک غیر متبدل اقدار ہیں اور اگر کوئی صاحب علم اور صاحب فہم فقیہہ اس پر خامہ فرسائی کرے تو مولانا کے نزدیک "تحریف دین" کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اس تناقض کو مولانا ہی دور فرما سکتے ہیں۔

۲۔ تشکیل فقہ جدید کی تجویز غالباً سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ نے پیش کی تھی لیکن وہ قدرے محدود تھی یعنی صرف اہل سنت کی چاروں فقہوں کو ملا کر ایک فقہ تیار کی جائے۔ اس کے بہت بعد ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور میں مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنی ایک تقریر میں اسی آواز کو بلند کیا جس پر علمائے کرام بہت برہم ہوئے اور بعضوں نے تو کفر تک کا فتویٰ ٹھونک دیا۔ اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر مدراس میں بزبان انگریزی بڑی جامعیت کے ساتھ اسی آواز کو اٹھایا ـــــ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ان سب باتوں کا علم ہے لیکن جب ادارۂ ثقافت اسلامیہ یہی تصور پیش کرتا ہے ـــــ اور صرف پیش ہی نہیں کرتا بلکہ ایسے مختلف مسائل کا حل معقول دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے تو مولانا کے لیے یہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اور وہ اس ادارے پر برسنے لگتے ہیں۔ اس تناقض کو دور کرنا بھی مولانا ہی کے ذمے ہے۔

۳۔ مولانا کے اس خیال سے ہم بالکل متفق ہیں کہ تشکیل فقہ جدید جامد اور کند ذہن علماء کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے صاحب علم و صاحب فہم فقہا ہی موزوں ہو سکتے ہیں۔

۴۔ ہم اس سے بھی اتفاق رکھتے ہیں یہ کام ندوۃ العلما کو کرنا چاہیئے تھا۔

۵۔ ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے کہ موجودہ ندوہ اس کا اہل نہیں رہا۔ اس لیے کہ متعصب مشرکوں کی ماتحتی میں رہ کر کبھی فکرِ آزاد نہیں پیدا ہو سکتی۔ اتنی بھی نہیں ہو سکتی جتنی انگریزوں کی ماتحتی میں موجود تھی۔ اُن پیش رووں میں حریت فکر کی رمق اس لیے باقی تھی کہ وہ ابھی نئے نئے مغلوب ہوئے تھے اور آزادی کا جذبہ اندر سے چٹکیاں لے رہا تھا۔ اور موجودہ ندوہ نے انگریزوں کی ماتحتی بھی دیکھی اور ہندوؤں کی ماتحتی بھی قبول کرلی۔ اس لیے وہ نماز روزے اور کلمہ خوانی سے آگے جانے کی ہمت نہیں رکھتا، اور بقولِ اقبالؒ سے

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر ندوے کے تعلیم یافتوں کو آزاد فضا نصیب ہو، تو حریتِ فکر اور تشکیلِ فقہ جدید کی تمام دبی ہوئی صلاحیتیں انہیں میں اُبھر سکتی ہیں۔

یہ شرف دنیائے معمورہ میں صرف پاکستان کو حاصل ہے کہ یہاں غالب اکثریت اسلام پسندوں کی ہے لیکن یہاں وہ استبداد نہیں جو مسائل کو صحیح خطوط پر سوچنے اور لکھنے میں رکاوٹ بنے۔ عمل پاکستانیوں کا بھی ہمارے نزدیک نہایت افسوس ناک ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کو دو ندوی علما ایسے دستیاب ہوگئے ہیں جن کو مولانا عبدالماجد صاحب کے الفاظ کے مطابق بلا تامل صاحب علم و صاحب فہم فقہا کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ہیں مولانا محمد حنیف صاحب ندوی جنہوں نے "مسئلہ اجتہاد" لکھ کر قوم پر ایک احسان کیا ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ فقہی جمود کو توڑ کر جدید اقدار کے مطابق اجتہادات کیئے بغیر چارہ کار نہیں اور قدیم چوکھٹوں میں رکھی ہوئی فقہ موجودہ دور میں چل ہی نہیں سکتی۔ دوسرے ندوی عالم ہیں مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی۔ انہوں نے ایک دو نہیں بیسیوں مسائل کو نئے سانچوں میں ڈھال کر مدلل طریقے سے پیش کیا ہے۔

اب یہ تناقص مولانا ہی دور فرما سکتے ہیں کہ وہ ایک طرف تو اہل ندوہ کو تشکیلِ فقہ جدید کی دعوت دیتے ہیں، اور جب کوئی ندوی فاضل ایسی تجاویز پیش کرے تو اس کی ہر تجویز سے اختلاف کرنا بھی ضروری خیال فرماتے ہیں۔

مولانا کو ایک تیز رفتار طیارے کی حیرت ناک سرعتِ رفتار سے نماز کے اوقاتِ پنجگانہ وغیرہ پر اثر پڑنے کا خطرہ اب پیدا ہوا ہے جس کے حل کے لیے وہ علمائے ندوہ کو یاد کر رہے ہیں۔ لیکن شاید اس سے زیادہ حیرت یہ سن کر ہوگی کہ ایک ندوی ہی عالم ایسے کسی واقعے کے ظہور سے دس سال پہلے اس پر اظہار خیال بھی کر چکا ہے اور اس کا حل بھی تلاش کر چکا ہے۔ ۴۸ء میں لاہور سے ایک ماہنامہ "اسلامی زندگی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے

تیسرے یا چوتھے شمارے میں مولانا شاہ محمد جعفر صاحب ندوی پھلواروی کا ایک مضمون "جوہری بم" کے متعلق شائع ہوا تھا۔ جو دراصل ایک عربی مقالے کا ترجمہ تھا۔ ترجمہ ختم کرنے کے بعد فاضل مترجم نے آخر میں یہ لکھا تھا کہ نہایت تیز رفتار طیارہ ایجاد ہونے کے بعد صورت حال یوں پیدا ہوگی کہ نماز کے اوقات اُلٹ جائیں گے۔ اس کے بعد اگست ۵۶ء کے ثقافت میں ایک مختصر سا مضمون "طیارے میں نماز" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں تقریباً یہی بات دہرائی گئی۔ اس مضمون کو ایک موقر ماہنامے نے بھی نقل کیا اور اس پر یہ نوٹ لکھا کہ: "خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں ایسے علما موجود ہیں جو اپنی فکر بلند سے ایسے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔" اس مضمون کا ضروری حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں جس سے آپ کو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ جس تشویش میں مولانا دریا بادی آج پڑے ہوئے ہیں اور اس کا حل انہیں نظر نہیں آتا اور اس کے حل کے لیے قدیم مجلس ندوہ کو یاد فرما رہے ہیں۔ وہ آج سے دس سال قبل ایک ندوی ہی فاضل کے قلم سے حل ہو کر نکل چکا ہے۔ ایک صاحب کے سوال کے جواب میں یہ فاضل ندوہ (مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی) لکھتے ہیں:

"آپ نے جو سوالات تحریر فرمائے ہیں وہ چند سال قبل خود میرے ذہن میں بھی آئے تھے ..... ..... اور میں نے ان کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں جوہری توانائی کے متعلق میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایک امکانی تصور پیش کیا گیا تھا۔ جو فقہی اقدار پر براہِ راست اثر انداز ہوتا تھا۔ لیکن یہ گمان تک نہ تھا کہ سات آٹھ سال کے بعد ہی وہ امکان ظہور میں آجائے گا۔ اس مضمون میں یہ بتلایا گیا تھا کہ اگر مستقبل قریب میں کوئی ایسا طیارہ ایجاد ہو گیا جس کی رفتار ہزار میل فی گھنٹہ سے زیادہ ہو اور وہ مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرے تو اس پر سفر کرنے والوں کے لیے اوقاتِ نماز کی فقہی قدریں بدل جائیں گی۔ کیونکہ وہ طیارہ سورج کے ساتھ ساتھ سفر کرے گا۔ اگر وہ ظہر کے وقت پرواز کرے، تو جب تک وہ اس رفتار سے اُڑتا ہے گا اس کے لیے ظہر ہی کا وقت رہے گا۔ اور فقہی اصول سے ـــــ شمسی معیار کے مطابق ـــــ عصر کا وقت نہ آئے گا۔ اور اگر رفتار ڈیڑھ دو ہزار میل فی گھنٹہ ہو جائے تو اوقاتِ نماز کی فقہی قدریں اُلٹ جائیں گی۔ یعنی اس طیارہ نے اگر عشاء کے وقت پرواز شروع کی ہے تو اس عشاء کے بعد صبح نہ آئے گی بلکہ عشاء کے بعد مغرب کی، مغرب کے بعد عصر کی، پھر ظہر کی اور پھر صبح کی نماز کا وقت آئے گا۔

سورج خود وقت نہیں۔ وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے۔ اگر یہ آلہ کسی وقت کارآمد نہ ہو تو کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کر لیا جائے گا۔ اب مسافر سورج کی بجائے اپنی گھڑی سے کام لے گا۔ اگر گھڑی کے حساب سے دوسری نماز کا وقت آگیا ہے تو سورج خواہ کہیں ہو وہ اپنی وہی دوسرے وقت کی نماز ادا کرے گا ـــــ سورج محض آلہ ہے اندازۂ وقت کا نہ کہ مقصود۔ غرض مقصد سے ہونی چاہیئے نہ کہ ذریعے

سے۔ جس طرح رویتِ ہلال کی صرف یہی اہمیت ہے کہ چاند ایک ذریعہ ہے آغازِ ماہ معلوم کرنے کا مقصد صیام یا عید یا دوسری تقریبات ہیں نہ کہ رویتِ ہلال۔ اسی طرح سورج کی اہمیت صرف یہی ہے کہ اس سے وقت معلوم کیا جائے۔ پیشِ نظر صورت میں یا تو گھڑی کے مطابق موجودہ ترتیب سے نمازیں ادا کی جائیں اور "سورج پوجا" چھوڑ دی جائے۔ یا پھر سورج ہی کے مطابق اُلٹی ترتیب سے یعنی صبح، ظہر، عصر، مغرب، عشار کی بجائے عشار، مغرب، عصر، ظہر اور صبح پڑھی جائے۔ دونوں صورتیں درست ہیں مقصود نہ سورج ہے نہ ترتیب فعلی۔ مقصود عبادت ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ہمارا موجودہ طریقۂ نماز بھی اصل مقصود نہیں۔ چنانچہ ایسے طیارے کا پائلٹ نہ ہماری طرح تحریمہ باندھے گا، نہ ہماری طرح قیام، رکوع، قومہ، سجدہ، قعود اور تسلیم کو ادا کرے گا۔ اس کی نماز ہماری موجودہ حرکات و کلمات کی بھی پابند نہ ہوگی۔ وہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم یا جالساً ہی اپنی نماز ادا کرے گا۔ اس کا پوری حاضر دماغی کے ساتھ پرواز کرتے رہنا بھی نماز ہی میں داخل ہوگا۔ اگر وہ فقہی نماز ادا کرنے لگے اور پرواز کے فرائض سے غافل ہو جائے تو تمام مسافروں کی زندگی ختم ہو جائے گی اور اس کی یہ نماز معصیت ہوگی۔

یہ ہے آپ کے سوالات کا جواب۔ لیکن مجھے اس موقع پر ایک خلش بے چین کر رہی ہے کہ ہم ان سوالات کا جواب کس کے لیے دے رہے ہیں؟ اس کے لیے جو پندرہ سو میل یا اس سے بھی زیادہ فی گھنٹہ چلنے والے طیارے کو چلا رہا ہو اور وہ ..... مسلمان ہو اور ..... پھر نمازی ہو ——— لیکن ایک "مسلمان" اور "نمازی" جب تک اس مقام پر پہنچے گا اس وقت تک یہ قدریں بھی بدل چکی ہوں گی اور سوال و جواب کا انداز بھی بدل چکا ہوگا۔ زمانہ ارتقا کی طرف تیزی کے ساتھ ——— طیارے سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ ——— آگے بڑھتا جائے گا۔ وہ نہ کسی قوم کی پرواہ کرے گا نہ کسی کے مسلک و فقہ کی۔ اور ہم جس مقام کے مسائل حل کرنے میں دس دن لگائیں گے زمانہ اس مقام سے سو سال آگے ہو چکا ہوگا۔ کچھ قومیں زمانے سے آگے سوچتی ہیں، کچھ زمانے کے ساتھ چلتی ہیں، اور ہم موجودہ دور کے مسلمان زمانے سے بہت پیچھے بھی سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔"

اس اقتباس سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جس تشکیلِ فقہِ جدید کے لیے مولانا دریا بادی قدیم ندوے کو فریاد کر کے بلا رہے ہیں وہ اگرچہ اس دنیا میں موجود نہیں لیکن وہی اسپرٹ رکھنے والے چند ندوی حضرات پاکستان میں موجود ہیں جو تشکیلِ فقہ جدید پر محض دعوت ہی نہیں دیتے بلکہ جب مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ جرأت مندانہ اقدام مولانا دریا بادی کو پسند نہیں۔ وہ بس اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو تشکیلِ فقہ جدید کی طرف صرف دعوت دی جاتی رہے اور کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ یعنی

اس کام کی طرف دعوت تو دیتے رہو لیکن کسی کو قدم نہ اٹھانے دو۔

ہمیں سخت تعجب ہوا جب ہم نے "نقوش" کے مکاتیب نمبر ص ۵۵۲ میں مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم کا ایک مطبوعہ خط دیکھا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"ثقافت لاہور سے پرچہ نکل رہا ہے۔ جعفر میاں اس کے بھی سرسید ہیں۔ کیا انہوں نے اجتہاد مطلق کے دروازے کو اپنے لیے وا فرما لیا ہے؟"

ہمیں خوشی ہے کہ مرحوم نے مولانا شاہ جعفر میاں کی تشبیہ کے لیے کسی گھٹیا شخصیت کو منتخب نہیں فرمایا۔ آج دنیا میں وہ موجود ہوتے تو ہم ان سے بھی کچھ سوالات کرتے۔ لیکن یہی صدائے بازگشت صدق جدید کے گنبد میں بار بار سنائی دیتی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ ایک طرف تجدید فقہ کی فضلائے ندوہ کو دعوت بھی ہے اور دوسری طرف یہ قدم اُٹھانے والے پر ملامت بھی۔ "سچی باتیں" لکھتے وقت اتنا تناقض تو نہ ہونا چاہیئے۔

مولانا دریابادی بھی یہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ اُمّت کے فقہی جمود کو ختم کرنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے کند ذہن، جامد فقہائے عظام کا یہ جمود اور کند ذہنی کیسے دُور ہو اور اس کا علاج کس طرح ہو؟ اسے ہم سے نہیں بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی زبان سے سنیئے۔ اس کا ایک علاج وہ یہ بتاتے ہیں کہ:

"نفس ناطقہ میں لطیف کیفیات پیدا کرنے کے لیے کند ذہن اور جامد طبیعت والے کو سماع کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ سماع میں رنگین اشعار ہوں اور وہ نغمے اور زیر و بم کے ساتھ گائے بھی جائیں۔ اور خاص طور پر وہ اشعار زیادہ موثر ہوتے ہیں جن میں اچھے استعارے ہوں، ان کے قافئے بہت عمدہ ہوں، ان کا اسلوب بیان بہت وجد آور ہو اس ضمن میں اس شخص کے لیے رباب اور طنبورے کی موسیقی بھی مفید ہے کیونکہ موسیقی سرور پیدا کرنے میں وہی تاثیر رکھتی ہے جو تاثیر کہ شراب میں ہوتی ہے۔ الغرض عشق پاکباز ہو یا سماع شعر و نغمہ اگر کند ذہن و جامد طبیعت والا برابر ان سے متمتع ہوتا رہے تو وقتاً فوقتاً اس کے نفس ناطقہ میں اس سے ایک نہ ایک کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس کا نفس ناطقہ ان کیفیات سے متصف ہو جاتا ہے چنانچہ اس طرح کند ذہن آدمی کا جمود ٹوٹ جاتا ہے۔" (ترجمۂ لمعات از پروفیسر محمد سرور صاحب ص ۱۶۸)

کیا ہم توقع کریں کہ مولانا دریابادی اپنا اور دوسروں کا جمود و کند ذہنی توڑنے کے لیے یہ نسخہ آزمائیں گے؟ خصوصاً وہ حضرات جو محدث موصوف کو اپنا امام مانتے ہیں؟

پھر مولانا دریا بادی اپنی "سچی باتیں" (مورخہ .....) میں لکھتے ہیں:
"حضرت مسلم بن عقیلؓ کا ذکر تو خیر شہادت ناموں میں آتا رہتا ہے۔ اور لوگ ان کے نام سے خاصے مانوس ہیں۔ لیکن ان کے والد ماجد حضرت عقیلؓ بن ابو طالب کے نام سے لوگ عام طور پر آشنا نہیں۔ حضرت علیؓ کے سوتیلے بھائی اور سن میں آپ سے بہت بڑے تھے۔ رسولؐ کے ایک ممتاز صحابی تھے اسد الغابہ میں، جو حالات و سیر صحابہ میں ضخیم، معتبر و مستند تصنیف ہے آپ کا ذکر بڑی تقطیع کے ڈھائی تین صفحوں میں تفصیل سے آیا ہے۔ صلح حدیبیہ سے قبل ہی اسلام لا کر ۸ہجری میں ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے۔ اور غزدۂ موتہ میں شریک جہاد رہے — قرضہ سے زیر بار تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں آ کر درخواست کی کہ یہ قرضہ ادا کر دیا جائے۔ آگے جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ کے صفحات میں یوں نقل ہوئی ہے:
خلیفہ - قرضہ کی رقم کتنی ہو گی۔

ع - ۴۰ ہزار

خ - اتنا تو میرے پاس بھی نہیں۔ البتہ ذرا انتظار رہے۔ مجھے ۴ ہزار سالانہ کی رقم ملتی ہے۔ وہ مل جائے۔ تو وہ آپ کے حوالہ کر دوں۔

ع - بیت المال کے مالک ہو کر میرے معاملہ کو ڈھیل میں ڈال رہے ہو۔

خ - تو کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں نے تو مجھے امین بنایا ہے اور میں اُن کا مال آپ کو دے دوں؟

---

نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے ناخوش ہو کر خلیفۂ وقت اور اپنے بھائی کی رفاقت چھوڑ امیر معاویہؓ کے پاس چلے جانے کی دھمکی دی۔ اور پھر اس پر عمل بھی کر گزرے، وہاں پہنچے تو خوب قدر اور خاطر داریاں ہوئیں اور ۵۰ ہزار درہم کی رقم عطا ہوئی۔ امیر نے پوچھا آپ نے علیؓ اور اُن کے رفیقوں کو کیسے چھوڑ دیا؟ جواب ملا کہ
"وہ لوگ اصحاب محمدؐ ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ رسولؐ ان کے درمیان موجود نہیں۔ اور یہاں اصحاب ابو سفیان ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خود ابو سفیان موجود نہیں۔"
ایک دوسرا مکالمہ اور بھی نقل ہوا ہے۔ امیر معاویہؓ نے ایک روز اپنے درباریوں سے کہا کہ "یہ اگر یہ نہ جانتے کہ میں ان کے حق میں ان کے بھائی سے بہتر ہوں تو یہ میرے پاس

اگر نہ رہتے ۔"

اس پر یہ بول اُٹھے، کہ

" نہیں دینی حالت میں تو میرا بھائی ہی میرے لیے بہتر ہے البتہ دنیا میں تم ہی بہتر ہو۔ تو میری دنیا تو بہتر ہو گئی ۔ اب اللہ کے فضل سے خیریت خاتمہ کی چاہتا ہوں ۔"

خلیفۂ برحق کی للہیت اور پختہ ایمانی، اور ہاشمی صحابیٔ رسولؐ کی جرأت اور حق گوئی اور اموی صحابی کا جود و کرم ۔ کتنے سبق اس ایک تذکرے سے نکل آئے ۔"

اس واقعے سے مولانا نے جو نتیجہ نکالا ہے اسے ایک بار پھر پڑھ جائیے ۔ ہم نے اس پر آپ کے غور کے لیے نشان لگا دیا ہے ۔ اس سے آپ مولانا کے "افکار عالیہ" اخلاقی نقطۂ نظر اور بلند پروازی کا بڑی آسانی سے اندازہ فرما سکتے ہیں ۔ ایک معمولی عقل والا انسان بھی اس سے جو صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مدیر صدق جدید نے پیدا کیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ جناب عقیلؓ نے کون سے ایسے نیک کام میں حصہ لیا تھا جو وہ چالیس ہزار درہم کے قرضدار ہو گئے تھے ؟ اگر کسی قومی مفاد میں اتنا کچھ خرچ کیا ہوتا تو سیدنا علیؓ بیت المال سے اس قرضے کو چکا دینے میں شاید تامل نہ فرماتے ۔ ان کا انکار کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ذاتی اخراجات یا اسراف کا نتیجہ تھا ۔ اور اسے محمود نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ چالیس ہزار درہم آج کل کے پندرہ بیس لاکھ روپے سے کم نہیں ۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے بیت المال سے یہ رقم خطیر وصول کرنے کی کیوں کوشش فرمائی ؟ اگر وہ بیت المال کو حکومت علیؓ کی ذاتی ملک سمجھتے تھے تو یہ بھی ان کی غلطی تھی اور اگر اسے سیدنا علیؓ کی ذاتی ملک نہ سمجھتے تھے تو آپ سے یہ مطالبہ کسی طرح بھی حق بجانب نہ تھا ۔ اسی لیے حضرت علیؓ نے دینے سے انکار کر دیا ۔

پھر لطف کی بات ملاحظہ ہو ۔ جب سیدنا علیؓ نے انکار فرما دیا تو جناب عقیلؓ ان سے ناراض ہو کر چلے گئے ۔ کہاں گئے ؟ جناب معاویہؓ کے پاس ۔ ایک خلیفۂ برحق سے ذاتی رنج کی بنا پر روگردانی کر کے اس کے مخالف کے پاس چلے جانا اور وہ بھی محض حصولِ زر کے لیے ، ایک ایسا کردار ہے جسے کسی صورت قابل ستائش نہیں قرار دیا جا سکتا ۔

آگے چلیے ۔ جناب معاویہؓ نے جناب عقیلؓ کو مطلوبہ چالیس ہزار درہم ہی نہیں دیئے بلکہ دس ہزار مزید بھی ۔ یعنی پورے پچاس ہزار ۔ سوال یہ ہے کہ جناب معاویہؓ نے یہ رقم خطیر کہاں سے دی ؟ بیت المال سے ۔ شریعت میں اس تصرف بے جا کا نام "خیانت" ہے اور اسی سے سیدنا علیؓ نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن مولانا کی اپنی گھڑی ہوئی اصطلاح میں اس تصرف بے جا کا نام " اموی صحابی کا جود و کرم " ہے ۔

پھر جناب عقیلؓ کا ایک اور کردار بھی ملاحظہ ہو جسے مولانا دریابادی اپنی دریا دلی سے "ایک ہاشمی صحابی کی جرأت و حق گوئی قرار دیتے ہیں۔ امیر معاویہؓ جناب عقیلؓ سے پوچھتے ہیں کہ: "آپ نے علیؓ اور ان کے رفیقوں کو کیسے چھوڑ دیا؟" اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ: "وہ لوگ اصحاب محمدؐ ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ رسولؐ ان کے درمیان نہیں۔ اور یہاں اصحاب ابوسفیان ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خود ابوسفیان موجود نہیں۔"

مدیر صدق جدید اردو کے ادیب بھی ہیں۔ انہیں چاہیئے تھا کہ اس "کیسے" کو ذرا صاف کر دیتے۔ اگر یہ "کیسے" بمعنی "کیوں" ہے تو عقیلؓ کا جواب بالکل بے ربط اور بے جوڑ ہے۔ اور اگر یہ "کیسے" بمعنی "کس حال میں" ہے تو مولانا کو اسے صاف کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن .....

پھر جب امیر معاویہؓ نے کہا کہ: "اگر یہ (عقیلؓ) یہ نہ جانتے کہ میں ان کے حق میں ان کے بھائی (علیؓ) سے بہتر ہوں تو میرے پاس آکر نہ رہتے۔" اس کا جواب جناب عقیلؓ نے یہ دیا کہ: "دینی حالت میں تو میرا بھائی (علیؓ) ہی میرے لیے بہتر ہے۔ البتہ دنیا میں تم ہی بہتر ہو۔ تو میری دنیا تو بہتر ہو گئی۔ اب اللہ کے فضل سے خیریت خاتمے کی چاہتا ہوں۔"

اگر یہ جواب سیدنا ابوہریرہؓ کے جواب کی طرح مزاحی انداز کا ہے ——— کہ کھانا معاویہؓ کے ساتھ کھاتا ہوں کیونکہ ان کا کھانا زیادہ اچھا ہوتا ہے اور نماز علیؓ کے پیچھے پڑھتا ہوں اس لیے کہ نماز ان کی اچھی ہوتی ہے ——— تو خیر چنداں مضائقہ نہیں ——— باما شراب خورد و بزاہد نماز کرد۔ لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ دین الگ چیز ہے اور دنیا علیحدہ شے۔ اس لیے دنیا حاصل کرنے کے لیے دیندار خلیفہ سے خفا ہو کر دنیا دار فرمانروا کی طرف چلے گئے اور اس فرمانروا کو بیت المال میں بے جا تصرف کا بخوشی موقع بھی دیا۔ تو اس کردار کو جناب عقیلؓ کی "جرأت اور حق گوئی" قرار دینا مدیر صدق جدید کو زیب نہیں دیتا۔

جناب مدیر صدق جدید نے اس واقعے سے جو نتائج سہ گانہ برآمد فرمائے ہیں ان میں صرف پہلا نتیجہ صحیح ہے یعنی "خلیفۂ برحق کی للّٰہیت اور پختہ ایمانی"۔ اسے بلاشبہ سچی باتوں ہی کے کالم میں ہونا چاہیئے لیکن دوسرے دو نتائج کے متعلق وہ خود فیصلہ فرمائیں یا قارئین کرام۔

مولانا دریابادی کے نزدیک کوئی ہم عصر قابل وقعت یا قابل ذکر نہیں ہوتا لیکن مرنے کے بعد وہ سند و حجت بن جاتا ہے۔ ابھی آپ نے اوپر دیکھا کہ فقہ جدید کی تدوین کے لیے کسی ہم عصر ندوی کو اہل نہیں سمجھتے لہٰذا مرے ہوئے ارباب ندوہ کو یاد فرما رہے ہیں۔ ایک منچلے نے شیعوں اور سنیوں کا فرق بڑے لطیف انداز سے یوں بتایا کہ: شیعہ وہ ہے جو ہر نیکو کار پر لعنت بھیجے اور سنی وہ ہے جو ہر غلط کار کو بھی (مرنے کے بعد) رحمۃ اللہ علیہ بنا دے۔ کچھ اسی قسم کا انداز مولانا دریابادی کا بھی ہے۔ ہر معاصر ان کے نزدیک خاطی اور

غلط کار ہے۔ اور ہر مردہ سند و حجت۔ ؎

تا کے بزیارت مقابر عمرے گزرانی اے فسردہ

یک گریۂ زندہ پیش عارف بہتر ز ہزار شیرِ مردہ

صحابۂ کرام کا اگر ادب مقصود ہے (اور ضرور ہونا چاہیئے) تو کسی ایسے واقعے کے ذکر سے ہی گریز کرنا چاہیئے جس میں کوئی پہلو ئے ذم پیدا ہو تا ہو۔ اور اگر ذکر کرنا ہی ضروری ہو تو تہذیب و خوش اسلوبی کے ساتھ خطا کو خطا اور صواب کو صواب ہی بتانا چاہیئے۔ یا پھر جرأت اور تحقیق سے کام لے کر اس واقعے کی معقول تردید یا توجیہہ کرنی چاہیئے۔ یہ کس قسم کی قدامت پرستی ہے کہ غلط روش کو "ہاشمی صحابی رسول کی جرأت اور حق گوئی" اور تصرف بے جا کو "اموی صحابی کا جود و کرم" بنا کر پیش کیا جائے؟ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ قصۂ آدم پڑھ کر فرشتوں کی تمنائے خلافت کو خدمتِ قومی کا جذبہ اور ابلیس کے انکار سجدہ کو خود داری و توحید کا اعلیٰ مقام قرار دیا جائے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ مولانا اپنے اس مخصوص کالم میں "سچی ہی باتیں" لکھا کریں گے اور سچے ہی نتائج بھی اخذ کیا کریں گے۔ ہماری روش یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ چونکہ شیعہ اپنے ائمہ کو "معصوم" قرار دیتے ہیں لہذا ہم بھی اپنے بزرگوں کو خطا اور معصیت دونوں میں معصوم قرار دیں۔

---


# سر سیّد کے مذہبی افکار (انگریزی)

مصنفہ بشیر احمد ڈار

ہندوستان میں تحریکِ اصلاح کے علمبردار سیّد احمد خاں کے افکار کی تشریح و توضیح۔ قیمت دس روپے۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور